مولانا محمد جعفر پھلواروی

مولانا شبیّر احمد عثمانی

چند ملاقاتوں کے تاثرات

شوقِ ملاقات کے اسباب

یہ اپریل ۱۹۴۹ کا ذکر ہے جبکہ میں کراچی میں تھا اپنے ایک دوست کے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانی کی قیام گاہ پر گیا۔ مولانا سے ملنے کا شوق محض اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک بڑے عالم اور اچھے مقرر ہیں بلکہ ملاقات کا اصلی جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ وہ تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم راہنما تھے۔ حالانکہ ایک ایسے تعلیمی ادارے سے ان کا تعلق تھا۔ جہاں دو ایک کے سوا سب کے سب کانگریسی تھے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔ ایک ایسے پختہ ماحول میں ایک فردِ واحد کا اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ابھرنا میرے لیے باعثِ تعجب ہونا چاہیے تھا۔ اس پر مزید یہ کہ اپنی آواز کو اس مردِ حق آگاہ نے محض نظریاتی دائرے تک محدود نہ رکھا بلکہ میدانِ عمل میں بھی کود پڑا۔ اسی ناسازگار ماحول میں اس کے خلاف اشتہارات نکالے گئے دھمکیاں دی گئیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ قتل تک کی دھمکی دی گئی۔ غرض مشکلات و موانع کی بہت سی دیواریں حائل ہوئیں لیکن کوئی شئی بھی ان کے عزم میں جنبش و لغزش نہ پیدا کر سکی۔ وہ اپنے ارادے اور اپنے نظریے پہ ڈٹے رہے۔ کلکتہ سے لے کر لاہور اور کراچی تک ہر جگہ مسلم لیگ کے عظیم الشان اجلاسوں میں اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ ایسا ہی مستقل مزاج عالم جمعیۃ العلمائے پاکستان کی صدارت کا مستحق ہو سکتا تھا۔ ان سے ملنے کا شوق دراصل انہی وجوہ سے پیدا ہوا تھا۔

فی الواقع یہ سوچنے کی بات ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا تو سبھی کر لیتے ہیں لیکن اخلاص کا

ثبوت اس وقت ملتا ہے جب کوئی تحریک ابتدائی مراحل سے گذر رہی ہو، آواز کمزور ہو اور ساہروانِ قافلہ گنتی کے چند ہی ہوں۔ پاکستان کے مخالف کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند، احرار، جماعتِ اسلامی، سارے ہندو، تمام انگریز اور جملہ نیشنلسٹ مسلمان ہوں، اور قائدِ اعظم کی آواز کی تائید کرنے والے فقط چند ہوں تو اس وقت اس آواز پر لبیک کہنا دو ہی باتوں کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ ایک یہ کہ لبیک کہنے والا اپنی مؤمنانہ فراست سے اس عظیم الشان قوت کو محسوس کر چکا ہے جو ایک کمزور تحریک کی نہ سے مستقبل میں ابھر کر سامنے آنے والی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس بظاہر بے جان سی تحریک کا ساتھ دینے والا صرف اس لیے ساتھ دے رہا ہے کہ وہ اسے حق سمجھ رہا ہے اور اس کا اخلاص اسے ساتھ دینے پر مجبور کر رہا ہے۔ غرض تحریک پاکستان کا ابتدا ہی میں ساتھ دینا فراستِ ایمانی اور اخلاصِ نیت دونو ہی کی دلیل تھی اور بادِ مخالف کے تند سے تند جھونکوں کی پروا کیے بغیر میدان میں خم ٹھونک کر کود پڑنا جرأتِ ایمانی کا ثبوت تھا۔

مولانا موصوف سے ملنے کے شوق کے جہاں یہ اسباب تھے وہاں ایک سبب اور بھی تھا اور وہ تھا "نظریہ قومیت" میں ہم دونوں کا ہم آہنگ ہونا۔ اس سے بہت پہلے مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کا باہمی مکالمہ۔ منثور و منظوم۔ اور مکالمۃ الصدرین مکمل طور پر دیکھ چکا تھا اور میرے ضمیر نے اقبال کے تصورِ قومیت کو ترجیح دی تھی۔ تحریکِ پاکستان کی اصلی اساس دو قومی نظریہ ہی ہے اس لیے علامہ اقبال کے تصورِ قومیت کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد میں قدرتی طور پر تحریکِ پاکستان کو بھی درست سمجھنے پر مجبور تھا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی اس دار العلوم سے تعلق رکھتے تھے جسے "ملت از وطن است" کے نعرے اور "متحدہ قومیت" کے تصور نے پوری طرح مسحور کر رکھا تھا۔ اسی کے در و دیوار سے ایک عالم کا دو قومی نظریے کی تائید میں نکل پڑنا ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے مولانا عثمانی سے بہت قریب کر دیا تھا۔ اور اس قرب و ہم آہنگی نے بھی میرے خنگِ شوق کو مہمیز لگانے کا کام کیا۔

تعارف اور مختصر ملاقات

میرے ساتھ جانے والے دوست نے مولانا سے میرا تعارف کرایا اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے سیدھے سادے تعارف کی بجائے کچھ مبالغات سے بھی کام لیا۔ اس تعارف سے مجھے صرف اس لیے شرمندگی ہوئی کہ اگر میں اپنے آپ کو ویسا نہ ثابت کر سکا جیسا کہ انھوں نے تعارف کرایا ہے تو مولانا کی نگاہ میں میرے دوست ویسے سچے نہ رہیں گے بہرکیف اس وقت مجھے یہی مناسب معلوم ہوا کہ صحبت زیادہ طویل نہ ہو۔ ادھر اُدھر کی رسمی گفتگو میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹہ لگا ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اجازت چاہی اور گھر آ گیا۔ اس وقت آنے کا مقصد بھی فقط ابتدائی تعارف تھا، نیز مولانا کی قیام گاہ معلوم کر لینا۔

نصبِ قضا پر گفتگو

کئی دن کے بعد میں تنہا ان کے پاس آیا۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ یہ دراصل ایک عربی مضمون تھا جو میرے ہی قلم سے تھا۔ اس کا عنوان تھا "پاکستان میں نصبِ قضا"۔ اسے کراچی کے عربی جریدہ الوعی میں شائع ہونا تھا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ یہ مضمون مولانا کی نظر سے گذر جائے۔ پہلے اس مضمون کا خلاصہ چند لفظوں میں سُن لیجیے۔

خلاصۂ مضمون یہ تھا:

"پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ اس لیے یہاں کے نظامِ عدالت کو بھی اسلامی ہی بنانا ضروری ہے تاکہ فیصلے اسلامی قانون کے مطابق ہوں اور فریقین کا وقت، روپیہ، توانائی اور ایمان و ضمیر ضائع نہ ہوا کریں۔ اس کے لیے غیر اسلامی قوانین کو ہٹا کر بتدریج اسلامی قوانین نافذ کیے جانے چاہئیں۔ البتہ یہاں ایک دشواری ضرور پیش آئے گی وہ یہ کہ اگر فریقین ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں مثلاً دو تو حنفی ہوں تو فیصلے میں آسانی ہوگی۔ کیونکہ ایک ہی فقہ کے رُو سے قاضی اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ دے گا۔ لیکن اگر فریقین کے مسلک جُداگانہ ہوں مثلاً ایک حنفی اور دوسرا شافعی ہو تو قاضی کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ اس خاص معاملے میں جس فرقے کی فقہ کو وہ اپنی صوابدید کے مطابق اقرب الی الکتاب والسنۃ سمجھے اس کے مطابق وہ

اپنا فیصلہ دے ۔ ۔ ۔ ۔

میرا عربی میں لکھا ہوا یہ مضمون مولانا عثمانی نے بڑے غور سے ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ: آپ کا مضمون بڑا اچھا اور عربی زبان بڑی شستہ ہے مگر مضمون کے آخری حصّے سے مجھے اتفاق نہیں۔" میں نے کہا: یہ میری ایک رائے ہے۔ حرفِ آخر نہیں۔ اس سے بہتر صورت اگر نکل سکے تو اسے قبول کرنے میں کم از کم مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ آپ اس کی اصلاح فرما دیجیے۔ اصلاح میں یہ وضاحت ہونی چاہیے کہ اگر فریقین دو فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں تو اس صورت میں فیصلہ کس کی فقہ کے مطابق ہو۔ لیکن دشواری یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر لیا گیا ہے۔ لہٰذا ہر اسلامی فرقے کا پاکستان پر یکساں حق ہے جس طرح حنفیت اسلام کی ایک تعبیر ہے اسی طرح دوسرے فرقے بھی اپنی اپنی فقہ کو اسلامی ہی فقہ سمجھتے ہیں اور خود ہم بھی کسی اسلامی فرقے کی فقہ کو غیر اسلامی نہیں کہہ سکتے۔ اگر کسی مخصوص فقہ کو ہم پورے ملک پر نافذ کر دیں تو دوسرے تمام فرقوں کے لیے اعتراض کا موقعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کا اصل علاج تو یہ ہے کہ تمام اسلامی فرقے کے علما پورے اخلاص و فراخدلی کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اپنی فرقی عصبیت سے بالاتر ہو کر باہمی رواداری کے ساتھ رائے مشورہ کر کے ایک ایسی فقہ تیار کریں جو تمام فرقوں کے لیے قابلِ تسلیم ہو اور حکومت اسے پورے ملک میں نافذ کر دے لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں بہت دیر لگے گی۔ اس لیے عبوری طور پر موجودہ عدالتیں اسلامی دارالقضا میں یوں تبدیل ہو سکتی ہیں کہ قاضی یا جج کسی ایک فرقے کی نمائندگی نہ کرے خصوصاً جبکہ فریقین دو مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہوں۔

مولانا عثمانی نے اس کے جواب میں کہا: "نہیں مجھے اس سے اتفاق نہیں" لیکن اس وقت میری پیش کردہ فصلِ خصومات کی دشواری کا کوئی حل نہیں بتایا۔ مولانا کو کہیں جانا بھی تھا اس لیے قبل اس کے کہ وہ خود تیار ہو کر اٹھ کھڑے ہوں، میں نے خود ہی جانے کی اجازت لے لی اور چلتے وقت عرض کیا کہ "اس دشواری کا کوئی ایسا حل پیش فرمائیے جس سے میری خلش دور ہو جائے۔ انشاءاللہ پھر حاضر ہوں گا۔"

ایک روایت پر گفتگو

کچھ دنوں کے بعد پھر مولانا کی قیام گاہ پر گیا۔ پچھلی گفتگو کو از خود چھیڑنا مجھے مناسب نہ معلوم ہوا۔ میں منتظر رہا کہ مولانا خود ہی میری پیش کردہ مشکلات کا کوئی حل پیش کریں اور میں کچھ حاصل کروں لیکن اس کا موقع نہ آیا اور گفتگو کا رُخ کسی اور طرف ہو گیا۔ کچھ کتاب و سنت کا ذکر چھڑ گیا تو ہماری باہمی گفتگو یوں ہوئی:

"بعض لوگوں کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی بعض روایتوں کے صحیح ہونے میں شبہ ہے۔ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"مثلاً وہ کونسی روایتیں ہیں؟"

"مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین جھوٹ بولے (لم یکذب ابراھیم الا ثلث کذبات)"

"یہاں لفظ جھوٹ (کذب) ہی کا آیا ہے۔ لیکن دراصل یہ حضرت ابراہیم کا "توریہ" تھا جھوٹ نہ تھا۔"

"مگر حدیث شفاعت میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب لوگ شفاعت کے لیے حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے تو آپ شفاعت سے پہلو بچانے کے لیے یہ عذر پیش کریں گے کہ میں دُنیا میں تین جھوٹ بول چکا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تین غلطیوں یا گناہوں کا اعتراف فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ توریہ کوئی ایسی غلطی یا گناہ نہیں جس پہ کوئی ندامت و شرمندگی ہو اور شفاعت سے گریز کیا جائے۔"

"ہاں یہ درست ہے کہ توریہ کوئی گناہ نہیں لیکن پیغمبر کو اتنی سی جائز بات بھی زیب نہیں دیتی۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین" (مقربین کا درجہ اتنا بلند اور نازک ہوتا ہے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے لیے گناہ کے ضمن میں آجاتی ہیں)

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ بقولِ امام رازی حضرت ابراہیمؑ کو غلطی کا مرتکب ماننے کے بجائے اس روایت کے کسی راوی کو غلطی کا مرتکب تسلیم کر لیا جائے۔ اس لیے کہ راوی کے صادق ہونے کے لیے کوئی نص نہیں۔ صرف گمان غالب ہے اور سیدنا ابراہیمؑ اور دوسرے انبیا کے لیے

نص موجود ہے۔ یعنی انہ کان صدیقا نبیا۔ وجعلنا لھم لسان صدق علیا وغیرہ۔

"مگر توریہ اور راست گوئی میں کوئی تضاد تو نہیں"

"اور اگر یہ واضح ہو جائے کہ جس چیز کو جھوٹ یا توریہ قرار دیا جا رہا ہے وہ دراصل سچ ہی ہے۔ جھوٹ نہیں ہے تو ان توجیہات کی ضرورت ہی نہیں"

"وہ کیونکر؟"

"وہ یوں کہ ہمارے شراح حدیث پہلا توریہ یہ بتلاتے ہیں کہ سیدنا ابراہیمؑ نے اپنی بیوی کو بہن کہہ دیا تھا۔ اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعۃً وہ بہن ہی تھیں۔ جبکہ بائبل سے معلوم ہوتا ہے وہ سوتیلی بہن تھیں (جس سے اس وقت کی شریعت میں نکاح جائز تھا) اگر ایک شخص سے کئی رشتے ہوں اور گفتگو میں ایک ہی رشتے پر اکتفا کر لیا جائے تو یہ کوئی جھوٹ نہیں ہوگا، بلکہ توریہ بھی نہ ہوگا۔

دوسرا جھوٹ یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ نے انی سقیم (میں بیمار ہوں) کہہ دیا تھا حالانکہ آپ بیمار نہ تھے۔ اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ دراصل بیمار نہ تھے لیکن کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں؟ کیا پیغمبر بیمار نہیں ہو سکتا؟ حضرت ابراہیمؑ نے جب یہ کہا کہ میں بیمار ہوں تو ہوں گے بیمار۔ خواہ مخواہ یہ فرض کرنے کی ضرورت کیا ہے کہ آپ دراصل بیمار نہیں تھے مگر کہہ دیا کہ بیمار ہوں۔؟

تیسرا جھوٹ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ نے ایک بڑے بت کے سوا باقی سب بتوں کو توڑ پھوڑ دیا اور پتہ چلنے کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ: اے ابراہیم! کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ تو آپ نے جواب دیا کہ: یہ حرکت اس بڑے بت نے کی ہے۔ حالانکہ یہ فعل اس بڑے بت کا نہ تھا بلکہ خود سیدنا حضرت ابراہیم کا تھا — اس کے بعد میں نے مولانا عثمانی کے سامنے آیت کی توجیہ یوں کی کہ لوگوں کا سوال یہ تھا کہ کیا یہ توڑ پھوڑ کی حرکت تم نے کی ہے؟ اس کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:

بل فعلہ قف کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون (بلکہ یہ کیا ہے

بڑے بُت صاحب تو یہ ہیں ان سے پوچھ لو اگر یہ جواب دے سکتے ہوں) یہاں حضرت ابراہیم نے فعلہ (یہ کیا ہے) کہہ کر فاعل کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ ذرا ٹھہر گئے۔ فاعل معلوم کرنے کا ان سب کو منتظر کر دیا۔ پھر دفعۃً گریز کر کے ایک دوسری بات شروع کر دی کہ سب سے بڑا تو یہ بُت ہے اس سے اور دوسرے بتوں سے دریافت کرو۔ اگر یہ تمہارے سوال کا جواب دے سکتے ہوں۔ دراصل یہ فعلہ کا فاعل کبیرھم ھذا نہیں کبیرھم ھذا ایک الگ ہی جملہ ہے۔"

مولانا نے میری ان توجیہات سے نہ پورا اتفاق کیا نہ پورا اختلاف۔ لیکن بڑے پیار اور خندہ پیشانی سے کہا کہ "ایک جلیل القدر پیغمبر کی پوزیشن کو ضرور بچانا چاہیے لیکن اگر کوئی ایسی صورت نکل سکے کہ روایت کا بھی ساتھ ساتھ احترام قائم رہے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ آپ کے نزدیک یہ توجیہ صحیح ہے کہ یہ تینوں باتیں سرے سے جھوٹ ہی نہیں اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ جھوٹ نہیں توریہ ہے اور "کذبات" کا لفظ انہی معنوں میں آرہا ہے۔ البتہ ایک پیغمبر کی بلند شان کو دیکھتے ہوئے توریہ بھی ذرا کم سطح کی بات ہے۔ اس لیے ہم نے ابھی کہا ہے حسنات الابرار سیئات المقربین۔ بہرحال میں اسے بہتر سمجھتا ہوں کہ روایات کا احترام باقی رکھا جائے۔ روایات کو غلط بتا کر الگ رکھ دینا ایک ایسا رجحان ہے جو اہل قرآن کے فرقے میں پایا جاتا ہے۔"

"کم از کم میرے متعلق آپ کو ایسی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔"

مولانا عثمانی اس پر ہنسے اور اس کے بعد اس دن کی مجلس برخاست ہوئی۔

حکومتِ اسرائیل پر گفتگو

کچھ عرصے کے بعد میں پھر مولانا سے ملنے گیا۔ یہ کشش اس لیے پیدا ہوتی کہ میں ہر نئی صحبت میں پہلی صحبت سے زیادہ متاثر ہوا۔ مولانا کی کرم فرمائی اور عزت افزائی بھی ہر نئی صحبت میں پہلے سے زیادہ ہوتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوتے گئے۔ وہ عالم بھی تھے اور باعمل بھی۔ مزاج میں سادگی اور بے تکلفی تھی۔ گفتگو کا انداز بڑا سنجیدہ اور عالمانہ ہوتا تھا۔ اگر ان کے پختہ خیالات کے خلاف بھی کوئی بات میری زبان سے نکل جاتی تو انھیں غصہ نہ آتا تھا۔ بڑے صبر و تحمل سے میری گفتگو سنتے اور میرے شبہات کا عمدہ جواب دیتے

کا انداز اختیار کرتے۔ اپنے خیالات کو ٹھونسنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ طبیعت میں شگفتگی اور سنجیدہ ظرافت بھی تھی۔ اکبر الہ آبادی کے اشعار بہت یاد تھے جو وہ نجی گفتگو میں بھی اور تقریروں میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ ممکن ہے میری کسی گفتگو سے انھیں کوئی ہلکی سی ٹھیس پہنچ گئی ہو۔ لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میری کسی بات کی اگر انھوں نے تردید بھی کی تو اس کا انداز یہ رہا کہ میری دلآزاری یا دل شکنی کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔ مولانا کی انہی شفقتوں نے مجھے زیادہ کھل کر بات کرنے کا موقع دیا تھا۔

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ: "ہم تو اب تک یہی سنتے چلے آئے تھے اور یہی مسلمانوں کا عقیدہ بھی بن گیا تھا کہ یہودیوں کی کہیں حکومت نہیں قائم ہوگی اور یہاں ہمارے دور میں اسرائیل کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس سے لوگوں کے عقیدے متزلزل ہوگئے ہیں"۔ کہنے لگے: "بھئی بچہ سقہ کی بھی حکومت قائم ہوئی تھی لیکن کیا اس چند روزہ حکومت کو آپ حکومت کہیں گے؟ اسرائیل کو ابھی کے دن ہوئے ہیں۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ آگے چل کر دیکھیے گا کیا ہوتا ہے۔ قومی زندگی میں سو پچاس سال بھی کوئی لمبی مدت نہیں ہوتی۔ اسرائیل کو تو ابھی چند ہی دن ہوئے ہیں"۔

قرارداد مقاصد اور اسلامی نظام پر گفتگو

ایک روز میں نے کہا: "قرارداد مقاصد پر آپ کی تقریر کا ریکارڈ میں نے ریڈیو پر سنا ہے۔ آپ نے اسے خود بھی ڈھیلا ڈھالا قرار دیا ہے۔ مجھے یہاں پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوتا نظر نہیں آتا۔ اگر خدانہ خواستہ اسلامی نظام قائم نہ ہوا تو لوگ آپ سے بھی پوچھیں گے کہ آپ نے تحریک پاکستان کی کیوں حمایت کی تھی؟" میری اس بات کا جواب بڑی سنجیدگی سے دیا کہ: "اگر پاکستان میں اسلامی حکومت نہ بن سکے تو "مسلمانی حکومت" تو رہے گی۔ اس وقت بھی ہماری ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ رہیں گی، ہم اسے غیر مسلم حکومت سے بہرحال بہتر سمجھیں گے۔ ترکی، ایران، افغانستان اور دوسری مسلمان حکومتیں ہماری نظروں میں امریکہ روس، برطانیہ سے زیادہ عزیز ہیں اور مسلمان ممالک کے ساتھ ہمدردیاں بہ نسبت غیر ممالک کے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ ایک فطری بات ہے"۔

میں نے مولانا کے اس جواب کی پوری پوری تائید کی اور بتایا کہ میں اس معاملے میں ہمیشہ

ہی سے آپ کا ہم خیال ہوں۔

ایک آیت قرآنی پر گفتگو

مولانا سے ایک صحبت بڑی دلچسپ رہی۔ اس صحبت میں تفسیری گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ:

"غارِ حرا میں پہلی وحی آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو کیفیت ہوئی اور جس طرح لرزتے کانپتے حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لائے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کو پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی کہ نبوت ملنے والی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو بھی جس طرح نبوت ملی اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبوت اچانک ملتی ہے۔ اس میں تدریج نہیں ہوتی جیسا کہ بعض جھوٹے دعویدارانِ نبوت کا عمل تھا کہ پہلے مجدد بنے، پھر مہدی ہوئے، پھر غیر تشریعی نبی ہونے کا ادعا کیا۔ پھر مکمل نبی بن بیٹھے۔ نبوت میں اس طرح کی تدریج نہیں ہوتی۔ ہونے والے ہر نبی کی طبیعت یا مزاج ابتدا سے صالح ہوتا ہے لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی پہلے سے یہ بات نہیں ہوتی کہ میں آئندہ نبی بننے والا ہوں۔ نبوت تو بس آجاتی ہے اور کسی انتظار و امید کے بغیر ہی اچانک آجاتی ہے۔ کیا آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق ہے؟"

"اختلاف کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔"

"پھر حضرت ابراہیمؑ کے متعلق قرآن پاک میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی کیا مناسب توجیہ ہو سکتی ہے؟ قرآن میں ہے کہ آپؑ نے پہلے ستارے کو دیکھ کر کہا کہ یہ میرا رب ہے۔ غروب ہونے کے بعد فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ پھر چاند کو اور پھر سورج کو دیکھ کر بھی ایسا ہی کچھ فرمایا اور آخر میں خدا کو پہچان لیا۔ قرآن کے اس بیان سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تدریجی غور و فکر کے بعد حقیقت کو پالیا اور نبوت کے مقام پر پہنچے حالانکہ اس طرح کی تدریجی نبوت سنتِ الٰہیہ کے مطابق نہیں۔"

"مفسرین نے اس کی کئی توجیہیں کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اظہارِ اعتقاد کے طور پر ھذا ربی، ھٰذا ربی کبھی نہیں فرمایا تھا۔ ھذا ربی استہزاء کے انداز سے اتمامِ حجت کے طور پر یہ بتانے کے لیے کہا تھا کہ دیکھو یہ سب ستارے، چاند اور سورج غروب ہو جاتے

ہیں اور یہ اپنی مرضی یا ارادے سے نہ طلوع و غروب ہو سکتے ہیں نہ اپنی رفتار کو تمھاری التجائیں سننے کے لیے روک سکتے ہیں۔ مَیں تو دراصل اس رب کا قائل ہوں جو ان سب کا خالق بھی ہے اور ان سب پر حکم بھی اسی کا چلتا ہے۔ ھٰذا ربی میں ایک طرح کا سوالیہ انداز بھی ہے یعنی بقول تم مشرکوں کے یہ ہے میرا رب؟ اچھا تمھیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔ ذرا اسے ڈھل کر بے نور ہو لینے دو پھر تمھیں سمجھاؤں گا کہ یہ کتنے بے بس اور تمھارے خود ساختہ رب ہیں۔ کسی لفظ کو اپنی زبان سے دہرانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے اعتقاد کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ دیکھیے حضرت ابراہیمؑ ہی کے قصے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فراغ الی الھتھم (حضرت ابراہیم ان کے معبودوں کی طرف چل پڑے) تو کیا یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ ان کے بتوں کو ان کا معبود مانتا ہے؟ یہ تو انہی مشرکوں کی زبان ہے جسے اللہ تعالیٰ نقل فرما رہا ہے۔ یہاں الھتھم سے مراد کوئی اظہار واقعہ نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے ان کے خود ساختہ معبود۔ اسی طرح سمجھ لیجیے کہ ھٰذا ربی سے مراد یہ نہیں کہ یہ ستارہ چاند یا سورج واقعی میرا رب ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بقول تمھارے یہ میرا رب ہے۔"

"اگر اجازت ہو تو ایک توجیہ مَیں بھی پیش کروں۔"

"ہاں شوق سے۔"

"واقعہ یہاں سے شروع ہوتا ہے:

واذقال ابراھیم لابیہ اٰزر اتتخذ اصناما اٰلھۃ؟ انی ارٰک وقومک فی ضلال مبین۔ (یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تو بھی بتوں کو معبود تسلیم کرتا ہے؟ مَیں تجھے اور تیری قوم کو صریح گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں)۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیمؑ اپنے مقام نبوت تک پہنچ چکے ہیں اور اپنے باپ کو بُت پرستی کی وجہ سے ملامت کر رہے ہیں اور ساری بت پرست قوم کو گمراہ سمجھ رہے ہیں بت تراشی تو خود آزر بھی کرتا تھا اور گویا اپنے ہاتھوں سے اپنے معبودوں کو بناتا تھا۔ اس کے بعد ان معبودوں کی باری آتی ہے جن کو انسان خود اپنے ہاتھوں سے نہیں بناتا اور وہ ہیں کواکب آسمانی۔ وکذالک نری ابراھیم ملکوت السموات والارض ولیکون من الموقنین۔

(اسی طرح ابراہیم کو ہم آسمانوں اور زمین کی بادشاہت کی سیر کراتے رہے تاکہ وہ اور پختہ ہو جائیں)
اس کے بعد ہی قرآن میں جو تفصیلات ہیں وہ دراصل ایک مکالمہ ہے۔ باپ اور بیٹے کے درمیان۔ ابراہیمؑ اور آزر کا لفظ پہلی ہی آیت میں موجود ہے۔ غلطی سے اگلی آیتوں میں ہر فعل کا فاعل صرف حضرت ابراہیم کو سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ کہیں ضمیر کا مرجع آزر ہے اور کہیں ابراہیم۔ وہ یوں کہ: فلما جن علیہ اللیل رای کوکبا قال ھذا ربی۔ آیت کے اس ٹکڑے کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔ جب ابراہیم پر رات چھا گئی تو ابراہیم نے ایک ستارہ دیکھا۔ پھر ابراہیم نے کہا کہ یہ ہے میرا رب۔ اس کا ترجمہ میری رائے میں یوں ہونا چاہیے کہ جب آزر پر رات چھا گئی تو آزر نے ایک ستارہ دیکھا اور آزر ہی نے کہا کہ یہ ہے میرا رب۔ یعنی یہاں علیہ، رای اور قال کی ضمیروں کا مرجع آزر ہے نہ کہ ابراہیمؑ۔ اس کے بعد فلما افل قال لا احب الآفلین۔ یہاں قال کا فاعل ابراہیمؑ ہے۔ یعنی جب وہ غروب ہو گیا تو ابراہیمؑ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔

آگے بھی اسی طرح کا باپ بیٹے کے درمیان مکالمہ ہے۔ یعنی پھر جب چاند چمکتا ہوا دیکھا۔ کس نے؟ آزر نے۔ تو کہا۔ کس نے؟ آزر نے، کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا۔ کس نے؟ ابراہیم نے کہ اگر اللہ میری ہدایت نہ کرتا تو میں بھی ان گمراہ لوگوں میں سے ہو جاتا۔ پھر جب چمکتا ہوا سورج دیکھا۔ کس نے؟ آزر نے۔ تو بولا۔ کون؟ آزر۔ کہ یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب یہ بھی غروب ہو گیا تو فرمایا کس نے؟ سیدنا ابراہیمؑ نے، کہ میں اپنا رُخ یکسوئی کے ساتھ اس ذات کی طرف پھیر چکا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو ایک فطرت پر پیدا کیا۔ (جس سے سرمو بھی انحراف کا وہ اختیار نہیں رکھتے)۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ دراصل پدر و فرزند کے درمیان ایک مکالمہ ہے۔ دونوں کے نام لے کر رکوع کا آغاز ہوا ہے۔ یہ دونوں اگلی آیات میں ضمائر کے دو مرجع ہیں اور بغیر کسی کھینچ تان کے آسانی سے ہر فعل کا فاعل یا ہر ضمیر کا مرجع معلوم ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ ذہن سے اس تصور کو دُور کر دیا جائے کہ ہر ضمیر کا مرجع صرف ابراہیم ہے۔ میری اس تفسیر یا توجیہ کے غلط ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس سے وہ تمام خرخشے دُور ہو جاتے ہیں جو ہر ضمیر کا مرجع ابراہیمؑ کو ماننے سے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ نے جو توجیہ پیش فرمائی ہے اس میں یہ بات مجھے بہت پسند آئی ہے کہ ھذا

دب کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنا اعتقاد ظاہر فرما رہے ہیں بلکہ انہی مشرکین کی زبان میں انہی کا لفظ انہی کے خود ساختہ معبودوں کے بارے میں استعمال فرما رہے ہیں۔ یہ بڑی اچھی توجیہ ہے۔ اس کے باوجود ایک خیال میں نے بھی پیش کیا ہے بہ نظرِ اصلاح۔"

"کیا کسی اور مفسّر نے بھی یہ تفسیر بیان کی ہے؟"

"اگر اور کسی نے نہیں لکھی ہے تو آپ لکھ لیجیے۔ اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟"

"ہمارے لیے اسلاف کے مسلک سے اتنی جلدی ہٹنا ذرا مشکل ہے تاہم آپ کی باتیں میرے زیرِ غور رہیں گی۔"

"یہ نکتہ میں نے نہیں پیدا کیا ہے، بلکہ میرے ایک بزرگ نے بیان فرمایا ہے، میں نے صرف اس لیے اسے پیش کیا ہے کہ اس نکتے کے متعلق آپ کا خیال معلوم کروں۔ مجھے خود یہ نکتہ بہت لگتا ہوا اور صحیح نظر آیا اور اسے قبول بھی کر لیا ہے۔ رہا آپ کا معاملہ تو میرے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ یہ تفسیر آپ کے زیرِ غور رہے گی۔" اس کے بعد میں اجازت لے کر گھر آ گیا۔

تنظیمِ مساجد کی تجویز

اس دوران ایک اور واقعہ پیش آیا اور مولانا نے اس سے بھی خاصی دلچسپی لی۔ ہوا یوں کہ میں نے اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو خط لکھ کر ملنے کی خواہش کی۔ گھر واپس آ کر مجھے ان کا جواب ملا کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت ملو۔ میں وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچا۔ خواجہ صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ وہ میرے خاندان سے بخوبی واقف تھے۔ ان سے میں نے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ ہے:

"مجھے پاکستان میں بہت سے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو اسلامی اساسیات سے صاف انکار کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ اللہ، رسول، وحی، روحانیت، ملائکہ، آخرت وغیرہ پر ایمان رکھنا بالکل غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ کمیونسٹ حلقے کے لوگ ہیں اور اپنے نظریات کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اگر حدود اللہ کو عبور کیے بغیر ہم کسی قوم کا معاشی نظام ترمیم کر کے قبول بھی کر لیں تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم یہ تو گوارا نہیں کر سکتے کہ اسلام کے اساسی اصولوں سے انکار کرنے لگیں اس

وقت حکومت اس خطرے کو محسوس کر رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس ملحدانہ خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ اگر واقعی ایسا کوئی خطرہ ہے تو اس کا مقابلہ صرف مادّی ہتھیاروں سے نہیں ہو سکتا۔ مادّی وسائل میں ہمارا اُن کا کوئی مقابلہ نہیں، ہاں ہم اگر کوئی مقابلہ کر سکتے ہیں تو روحانی اقدار کی پختگی سے ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں جو تجویز آئی ہے وہ ہے تنظیم المساجد، میرا مطلب یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی تنظیم کا مرکز مساجد کو بنائے لیکن پہلے ائمۂ مساجد کو ایک ایسا کورس پڑھا کر پختہ کر دیا جائے جو نظریاتی مقابلے کے لیے بالکل کافی ہو اور وہ ائمہ اپنے اپنے مقتدیوں کو تمام غیر اسلامی خطرات سے آگاہ کرتے رہیں۔ ان میں خالص اسلامی پختگی پیدا کرتے جائیں۔ افرادِ قوم کے اذہان اگر صحیح خطوط پر چلنے لگیں تو بڑی سے بڑی مادّی قوت بھی ان پر غالب نہ آسکے گی۔"

میں ایک صحبت میں مولانا شبیر احمد عثمانی سے اپنی اس اسکیم کا کچھ دنوں پہلے ذکر کر چکا تھا اور انھوں نے اسے بہت پسند کیا تھا۔ دوسرے دن میں مولانا عثمانی کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی خلافِ معمول بول اُٹھے: "آخاہ آیئے تشریف لایئے"۔ پھر کہنے لگے: "کل آپ خواجہ ناظم الدین صاحب سے ملنے گئے تھے نا؟ آپ کے واپس چلے جانے کے فوراً بعد انھوں نے مجھے بلوا کر کہا کہ ایک صاحب ابھی آئے تھے اور الحاد کی روک تھام کے لیے یہ اسکیم بتا گئے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟" میں سمجھ گیا کہ یہ وہی اسکیم ہے جو آپ میرے سامنے بھی پیش کر چکے ہیں اور میں نے اس کی تائید کی تھی۔ خواجہ صاحب نے جب میری رائے پوچھی تو میں نے زوردار تائید کی۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی جائے۔"

میں نے مولانا سے کہا: "اب مجھے یقین سا ہو گیا ہے کہ خواجہ صاحب کچھ نہیں کریں گے کیونکہ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جو کام نہ کرنا ہو، اسے کمیٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔" مولانا کو اس پر ہنسی آگئی۔ پھر میں نے کہا: "اب کراچی میں میرے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہاں یہ کام ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ سنٹر کو چھوڑ کر کسی صوبے سے کام شروع کیا

جائے؟ میں نے سنا ہے کہ اس قسم کا کچھ کام صوبۂ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کر رہے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ وہاں چلا جاؤں۔ لیکن میرا ان کا پہلے سے کوئی تعارف نہیں۔ اگر آپ تعارف کا ذمہ لیں تو میں وہاں جا کر ان سے گفتگو کروں گا۔"

مولانا نے کہا: "میرے اور خان عبدالقیوم خان کے تعلقات گہرے تو نہیں لیکن بہرحال آپ کے لیے ان کے نام تعارف نامہ ضرور لکھوں گا۔" یہ کہہ کر مولانا عثمانی نے جمعیتہ العلمائے اسلام کا لیٹر پیڈ نکالا اور قلم چلنے لگا۔ تعارف نامے اور مقصد کی وضاحت بڑی عمدگی سے کی اور خط میرے حوالے کر دیا۔ یہ خط لے کر میں لاہور آ گیا لیکن کچھ ایسی مصروفیات دامنگیر ہوئیں کہ میں پشاور نہ جا سکا۔ یہاں تک کہ خان صاحب سنٹر کے وزیر بنا دیے گئے۔ یہ خط مجھ سے پروفیسر انوار الحسن صاحب مانگ کر لے گئے اور اپنی کتاب "انوار عثمانی" میں شائع کر دیا۔ لیکن مجھے افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ خط کا وہ حصہ غائب کر دیا گیا ہے جس میں مولانا نے میرے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تعارف کرایا تھا۔ میں نے پروفیسر صاحب موصوف کی فرمائش پر ایک مضمون بھی لکھ کر دیا تھا۔ جس میں اپنی ملاقاتوں کا اور اپنے تاثرات کا ذکر کیا تھا۔ غالباً اسے بھی انھوں نے شائع نہیں کیا۔ ایک عرصۂ دراز کے بعد تقریباً وہی تاثرات آج پھر دہرا رہا ہوں۔

یہ خط جوری ۱۹۶۹ کے پرچے میں شائع کر دیا ہے؟

مقالات

یہ کتاب مولانا محمد جعفر پھلواروی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ماہنامہ "ثقافت" اور دیگر مجلات میں شائع ہوتے رہے ہیں ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پرانی باتیں نہیں دہرائی گئیں ہیں، بلکہ نئے افکار، نئی تحقیقات اور نئے استدلال ہیں اور اجتہاد وفکر کا رنگ نمایاں ہے۔ اس مجموعہ میں تاریخی، دینی، فقہی، عقلی، ثقافتی ہر طرح کے مضامین شامل ہیں۔

قیمت: ۵۰ / ۱۰ روپے

سکریٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور